ڈاکٹر راجندر پرشاد

عظیم قومی رہنما اور پہلے راشٹر پتی

از

عبداللطیف اعظمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	1985
چوتھی طباعت	:	2011
تعداد	:	2100
قیمت	:	-/10 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	488

Dr. Rajinder Prasad

By

Abdul Latif Azmi

ISBN :978-81-7587-695-8

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066
فون نمبر: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho(Top) کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

پیارے بچو! علم حاصل کرنا وہ عمل ہے جس سے اچھے برے کی تمیز آجاتی ہے۔ اس سے کردار بنتا ہے، شعور بیدار ہوتا ہے، ذہن کو وسعت ملتی ہے اور سوچ میں نکھار آجاتا ہے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کی ضامن ہیں۔

بچو! ہماری کتابوں کا مقصد تمھارے دل و دماغ کو روشن کرنا اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں سے تم تک نئے علوم کی روشنی پہنچانا ہے، نئی نئی سائنسی ایجادات، دنیا کی بزرگ شخصیات کا تعارف کرانا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اچھی اچھی کہانیاں تم تک پہنچانا ہے جو دلچسپ بھی ہوں اور جن سے تم زندگی کی بصیرت بھی حاصل کرسکو۔

علم کی یہ روشنی تمھارے دلوں تک صرف تمھاری اپنی زبان میں یعنی تمھاری مادری زبان میں سب سے موثر ڈھنگ سے پہنچ سکتی ہے اس لیے یاد رکھو کہ اگر اپنی مادری زبان اردو کو زندہ رکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ اردو کتابیں خود بھی پڑھو اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھواؤ۔ اس طرح اردو زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں تم ہمارا ہاتھ بٹا سکو گے۔

قومی اردو کونسل نے یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کے علم میں اضافہ کرنے کے لیے نئی نئی اور دیدہ زیب کتابیں شائع کرتی رہے جن کو پڑھ کر ہمارے پیارے بچوں کا مستقبل تابناک بنے اور وہ بزرگوں کی ذہنی کاوشوں سے بھرپور استفادہ کرسکیں۔ ادب کسی بھی زبان کا ہو، اس کا مطالعہ زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

دیباچہ

آزادی کے بعد جہاں ملک کے ہر میدان میں ترقی ہوئی ہے، وہاں اردو ادب نے بھی کافی ترقی کی ہے۔ کوئی زبان اور اس کا ادب اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا، جب تک اس میں ادب کی تمام شاخوں میں اچھی اور اونچی کتابیں نہ ہوں۔ خاص طور پر یونیورسٹیوں میں جو مضامین پڑھائے جاتے ہیں، ان سب کے بارے میں معیاری کتابیں نہ ہوں اس وقت تک ہماری زبان کا ادب مکمل نہیں سمجھا جائے گا۔ اسی طرح بچوں کے ادب کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ آزادی سے پہلے بچوں کے لیے جو کتابیں لکھی گئی تھیں، ان میں بہت سی خرابیاں تھیں، ایک تو ان میں زیادہ تر کہانیاں تھیں اور وہ بھی دیکھنے میں زیادہ خوبصورت نہیں تھیں۔ انھیں سب باتوں کی بنا پر آزادی کے بعد سرکار کی مدد سے اور اس کے انتظام میں بہت سے ادارے قائم کیے گئے تاکہ ملک کی دوسری زبانوں کی طرح اردو میں بھی ادب کے ہر پہلو پر اچھی اچھی کتابیں لکھوا کر چھاپی جائیں، انھیں اداروں میں ایک ترقی اردو بیورو ہے جو بڑوں کے لیے بھی اور بچوں کے لیے بھی اچھی اچھی کتابیں چھاپتا ہے جو دیکھنے میں بھی اچھی ہوتی ہیں اور معیار کے لحاظ سے بھی اچھی ہوتی ہیں۔

بچوں کی کتابوں میں ایک کمی پہلے بھی اور اب بھی بہت حد تک ہے، وہ یہ کہ ملک کے بڑے بڑے لوگوں کے بارے میں اچھی کتابیں بہت کم ہیں۔ اس وقت آپ کے ہاتھ میں جو کتاب ہے وہ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب کو آپ پڑھیں گے تو معلوم ہوگا کہ ڈاکٹر راجندر پرشاد ہمارے ملک کے بہت بڑے

آدمی تھے، انھوں نے ملک کی آزادی میں بہت بڑا حصّہ لیا، ملک کے لوگوں کی بڑی خدمت کی اور اپنی پوری زندگی ایسے ہی اچھے اور مفید کاموں میں صرف کردی۔ ان کا ہم سب پر، چھوٹے ہوں یا بڑے، بہت بڑا احسان ہے۔ اس احسان کو اتارنے کی ایک اچھی صورت یہ ہے کہ ہم سب ان کی اچھائیوں کو اختیار کرنے اور ملک و قوم کی خدمت کی کوشش کریں۔

پچھلے سال ۳ر دسمبر ۱۹۸۴ء کو ڈاکٹر راجندر پرشاد کی پیدائش کو سو سال پورے ہوگئے تھے چنانچہ ان کی یاد منانے کے لیے پورے ملک میں جلسے کیے گئے اور اخباروں میں اچھے اچھے مضمون لکھے گئے۔ اسی سلسلے میں یہ کتاب بھی لکھی گئی ہے۔ امید ہے کہ بچوں کو پسند آئے گی۔

عبداللطیف اعظمی

فہرست

۱	خاندان، پیدائش اور تعلیم	7
۲	سیاست سے دلچسپی	15
۳	باپو کے قدموں میں	17
۴	عارضی حکومت میں وزیر	21
۵	دستور ساز اسمبلی کی صدارت	22
۶	عارضی راشٹرپتی	25
۷	پہلے راشٹرپتی	26
۸	دوبارہ راشٹرپتی	29
۹	مذہب کا گہرا اثر	30
۱۰	شخصیت	35

ڈاکٹر راجندر پرشاد

ڈاکٹر راجندر پرشاد، ہمارے دیش کے ان لیڈروں میں سے ہیں جو ملک کی غلامی کو ہٹانے اور آزادی کو حاصل کرنے کے لیے کگے آگے تھے اور جنھوں نے سب سے زیادہ اور بڑھ چڑھ کر آزادی کی لڑائی میں حصّہ لیا اور قربانیاں کیں اور جیل کی مصیبتیں برداشت کیں۔ جب آزاد ہندوستان کے لیے قانون بنانے کے لیے اسمبلی چنی گئی جسے انگریزی میں کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی، ہندی میں ودھان سبھا اور اردو میں مجلس دستور ساز کہتے ہیں۔ تو بابو راجندر پرشاد اس کے صدر چنے گئے۔ اور جب یہ دستور تیار ہو گیا اور ملک میں نافذ (لاگو) کر دیا گیا تو باقاعدہ چناؤ سے پہلے انھیں عارضی طور پر ملک کا راشٹرپتی مقرر کیا گیا اور چناؤ کی تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں تو تمام لوگوں کی رائے سے پانچ سال کے لیے ان ہی کو مستقل راشٹرپتی منتخب کیا گیا۔ اور جب یہ مدت پوری ہو گئی تو قوم نے دوبارہ ان ہی کو راشٹرپتی منتخب کیا۔ اس طرح عارضی مدّت کو ملا کر وہ کوئی ۱۲ سال تک دیش کے راشٹرپتی رہے۔ یہ ایک شاندار ریکارڈ ہے۔ اب تک کوئی بھی راشٹرپتی اتنی زیادہ مدت کے لیے ملک کے اس سب سے بڑے عہدے پر فائز نہیں رہا ہے۔

خاندان، پیدائش اور تعلیم

ڈاکٹر راجندر پرشاد، صوبہ بہار کے رہنے والے تھے اور کاستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دادا کا نام مشری لال اور والد کا نام مہادیو سہائے تھا۔ راجندر پرشاد جی کو لوگ پیار سے راجن بابو کہتے تھے۔ یہ نام مختصر بھی ہے اور اچھا بھی، اس لیے آئندہ

ہم زیادہ تر یہی نام لکھیں گے۔ ہاں تو راجن بابو نے "اپنی کہانی" میں اپنے بزرگوں کے بارے میں لکھا ہے، "یو پی (اتر پردیش) میں امورھا نام کی ایک جگہ ہے، سنتے ہیں کہ وہاں کائستھوں کی اچھی بستی ہے۔ بہت دن پہلے وہاں سے ایک خاندان نکل کر پورب چلا اور بلیا جا بسا۔ طویل مدت تک بلیا میں رہنے کے بعد اس خاندان کی ایک شاخ آتر کی طرف چلی گئی اور آج کل کے ضلع سارن (بہار) کے زیرادیئی گاؤں میں رہنے لگی، دوسری شاخ گیا میں جا کر بس گئی۔ زیرادیئی والا خاندان ہی میرے بزرگوں کا خاندان ہے۔ شاید زیرادیئی میں آنے والے میرے بزرگ مجھ سے پہلے کی ساتویں یا آٹھویں پشت میں تھے جو زیرادیئی میں آئے تھے، وہ غریب تھے اور روزگار کی تلاش میں ہی ادھر آگئے تھے اس گاؤں میں کوئی پڑھا لکھا نہیں تھا اور اُن دنوں بھی کائستھ تو تعلیم یافتہ ہوا ہی کرتے تھے اس لیے گاؤں کے لوگوں نے ان کو وہاں رکھ لیا۔"

راجن بابو اپنے اس خاندان میں ۳؍دسمبر ۱۸۸۴ء کو زیرادیئی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے پانچ بھائی بہن تھے، ان کے والد زمینداری کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق ان کے والد فارسی بہت اچھی جانتے تھے، تھوڑی بہت سنسکرت سے بھی واقف تھے۔ آیورویدک اور طب سے بھی ان کو دلچسپی تھی۔ انھوں نے ان کی باقاعدہ اسکول یا کالج میں تعلیم تو حاصل نہیں کی تھی مگر اپنے طور پر کتابیں پڑھ کر بڑی جانکاری حاصل کر لی تھی اور لوگوں کا علاج بھی کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے وہ اپنے علاقے اور آس پاس کے علاقوں میں بہت مشہور ہو گئے تھے۔

جب راجن بابو پانچ سال کے ہوئے تو ان کو مکتب میں بٹھایا گیا اور اس وقت کی رسم کے مطابق ایک مولوی صاحب نے بسم اللہ کرائی۔ زیرادیئی میں کوئی اسکول نہیں تھا، اس لیے سال ڈیڑھ سال کے بعد ان کو جب فارسی اور گنتی آگئی تو اسکول کی پڑھائی کے لیے انھیں چھپرا بھیج دیا گیا۔ جہاں ان کے بڑے بھائی انٹرنس میں پڑھتے تھے۔ اس زمانے میں پڑھائی کا طریقہ آج کل سے کچھ مختلف تھا۔ درجوں اور ترقی کی ترتیب آج کل کے لحاظ سے الٹی تھی۔ یعنی اس کی ترتیب اوپر سے نیچے کو آتی تھی۔ مثلاً پہلے درجے کو انٹرنس کہتے تھے۔ اور ابتدائی درجے کو آٹھواں۔ جب کوئی آٹھواں درجہ پاس کر لیتا تھا تو وہ ترقی کر کے ساتویں درجے میں جاتا تھا اور ساتویں سے چھٹے میں اور اسی طرح ترقی کرتا ہو

پہلے درجے میں پہنچتا تھا جسے انٹرنس کہا جاتا تھا۔ راجن بابو کا داخلہ آٹھویں درجے میں ہوا اور جب امتحان کا نتیجہ نکلا تو وہ اول آئے۔ اس شاندار کامیابی کی وجہ سے ان کو دوگنی ترقی دی گئی۔ یعنی ساتویں کے بجائے ترقی دے کر چھٹی کلاس میں بھیج دیے گئے بڑے بھائی نے انٹرنس کا امتحان پاس کر لیا تو وہ کالج کی تعلیم کے لیے پٹنہ چلے گئے۔ اس کی وجہ سے راجن بابو کو بھی پٹنہ جانا پڑا۔ جہاں ٹی۔ کے گھوش اکاڈمی نام کے ایک اسکول میں جو ان دنوں بہت مشہور تھا، داخلہ لیا۔ دو سال میں چھٹے درجے سے پانچویں میں اور پانچویں درجے سے چوتھے میں پہنچے۔ مگر اسی درمیان میں ان کے بڑے بھائی نے ایف اے پاس کر لیا اور بی اے میں داخلہ لینے کے لیے کلکتہ چلے گئے۔ اس لیے مجبوراً راجن بابو کو بھی پٹنہ چھوڑنا پڑا۔ اب ریاست ہتھوا کے اسکول میں انھوں نے داخلہ لیا۔ لیکن وہاں کی تعلیم کچھ ایسی تھی کہ راجن بابو کا وہاں جی نہیں لگا۔ اس کے علاوہ وہ بیمار بھی پڑ گئے اور سالانہ امتحان تک بیمار رہے۔ جس کی وجہ سے وہ امتحان نہ دے سکے اگلے سال وہ پھر چھپرا گئے اور وہاں چوتھے درجے میں داخلہ لیا۔ یہاں کی پڑھائی بہت اچھی تھی، استاد بھی اچھے تھے۔ اس لیے راجن بابو نے خوب جی لگا کر پڑھائی کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد اسکول کے بہترین لڑکوں میں ان کی گنتی ہونے لگی اور پچھلے سال پڑھائی میں جو گڑبڑی ہو گئی تھی، اس کی کسر نکل گئی۔

سالانہ امتحان کا زمانہ آیا تو چھپرا میں پلیگ کی بیماری پھیل گئی، راجن بابو نے ابھی دو ہی پرچوں کا امتحان دیا تھا کہ بیمار پڑ گئے۔ گھر کے لوگوں کو خبر ملی تو آ کر ان کو گھر لے گئے۔ اس کی وجہ سے وہ باقی دو پرچوں کا امتحان نہ دے سکے۔ لیکن امتحان سے پہلے انھوں نے ڈٹ کر جو تیاری کی تھی وہ کام آئی۔ جن دو پرچوں کا امتحان دیا تھا انہیں میں ان کو اتنے نمبر مل گئے کہ وہ پاس ہو گئے اور ترقی کر کے پہلے درجے یعنی انٹرنس میں پہنچ گئے، یہی نہیں چونکہ وہ اچھے طالب علموں میں سے تھے، ہمیشہ امتحان میں پوزیشن حاصل کرتے تھے۔ اس وقت بھی ان کے نمبر اچھے تھے۔ اس لیے ان کو وظیفہ بھی ملا اس سے راجن بابو کا حوصلہ بڑھا اور انٹرنس کی پڑھائی میں پہلے سے بھی زیادہ محنت کی۔ اس زمانے میں اچھے نمبروں سے پاس ہونے والے طالب علموں کو تین قسم کے وظیفے دیے جاتے تھے۔ سب سے بڑا وظیفہ بیس روپے مہینے کا تھا۔ جو آج دس

طالب علموں کو دیا جاتا تھا جو یونیورسٹی بھر میں اول آئیں۔ دوسرا پندرہ روپے کا وظیفہ ان دو یا تین طالب علموں کو دیا جاتا جو پورے ڈویژن میں اول آئیں۔ تیسرا ان دو یا تین طالب علموں کو دس روپے کا وظیفہ دیا جاتا جو ضلع بھر میں اول آئیں۔ اس زمانے میں بہار، صوبہ بنگال کے ماتحت تھا۔ اور کلکتہ یونیورسٹی کے نیچے بنگال، بہار، اڑیسہ، آسام اور برما تک کے کالج آتے تھے۔ اور ان سب کا امتحان ایک ہی ہوتا تھا۔ اس لیے راجن بابو سمجھتے تھے کہ ان کو تیسرا وظیفہ دس روپے والا مل سکتا ہے اور اگر بہت محنت کی تو دوسرا وظیفہ پندرہ روپے کا شاید مل جائے۔ پہلے وظیفے کے بارے میں تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ مگر انھوں نے لگاتار اتنی سخت محنت کی کہ جب امتحان کا نتیجہ نکلا تو وہ پوری یونیورسٹی میں اول آنے والے طالب علموں میں تھے۔ اور ان کو بیس روپے مہینے کا وظیفہ ملا۔ راجن بابو پہلے بہاری طالب علم تھے جن کو یہ عزت حاصل ہوئی تھی۔ اس شاندار کامیابی پر ان کو جو خوشی ہوئی وہ تو ہوئی، اس سے زیادہ ان کے گھر والوں اور ان کے استادوں کو ہوئی۔ نتیجہ نکلنے کے بعد وہ چھپرا گئے تو سب سے پہلے اپنے استاد رسک بابو سے ملے جو ان سے بہت محبت کرتے تھے جب وہ رسک بابو سے ملے تو انھوں نے ان کی شاندار کامیابی پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے دل سے مبارکباد دی اور فوراً مٹھائی منگوا کر راجن بابو کا منہ میٹھا کیا اس کے بعد بہت سے مفید مشورے دیے۔ راجن بابو "اپنی کہانی" میں لکھتے ہیں: "مجھے بہت دیر تک سمجھاتے رہے کہ اس نتیجے سے میری ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ کوئی بہاری یونیورسٹی میں اول آیا ہے۔ بنگال کے لڑکے اسے برداشت نہیں کر سکیں گے، وہ مجھے ایف اے میں پچھاڑنے کی کوشش کریں گے۔ کچھ بُرے لڑکے اور طرح بھی گرانے کی کوشش سے باز نہیں آئیں گے۔ اس لیے کلکتہ میں مجھے بڑی احتیاط سے رہنا ہوگا اور محنت کر کے جو مقام میں نے پایا ہے۔ اسے قائم رکھنا چاہیے۔"

گھر کی مالی حالت اگرچہ بہت اچھی نہیں تھی، مگر راجن بابو کی محنت اور ان کی شاندار کامیابی کو دیکھ کر ان کے والد نے آگے کی تعلیم کے لیے کلکتہ بھیجنے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ جب داخلے شروع ہوئے تو وہ کلکتہ گئے اور پریسیڈنسی کالج میں داخلہ لیا۔

یہاں کا ماحول اور رہن سہن سب راجن بابو کے لیے بالکل نیا تھا۔ طالب علم زیادہ تر کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھے، کچھ ہیٹ بھی لگائے ہوئے تھے۔ ان کے مقابلے میں راجن بابو ہندوستانی لباس میں تھے۔ یعنی اچکن، پائجامہ اور ٹوپی۔ ان کے اس لباس کو دیکھ کر پہلے دن جب وہ کلاس میں گئے تو لوگوں نے انھیں سلمان سمجھا۔

راجن بابو کلکتہ جاتے ہی ملیریا میں مبتلا ہو گئے۔ جس کی وجہ سے بہت دنوں تک وہ کالج نہ جا سکے اور ان کی حاضری کم ہو گئی۔ مگر اچھے ہونے کے بعد پابندی سے کلاس میں حاضری دے کر، ایک طرف حاضری بھی پوری کر دی، اور پڑھائی کا جو نقصان ہوا تھا۔ اسے بھی پورا کر دیا۔ اس زمانے میں ایف اے تک سائنس اور آرٹ کے مضامین ساتھ ساتھ پڑھائے جاتے تھے۔ بی اے میں سائنس اور آرٹ کے مضامین الگ الگ ہو جاتے تھے۔ راجن بابو بی اے میں سائنس لینا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے سائنس کی طرف زیادہ توجہ کی۔ لیکن جب ایف اے کا نتیجہ نکلا تو وہ فرسٹ ڈویژن میں کامیاب تو ہو گئے۔ مگر سائنس میں ان کے نمبر دوسرے ساتھیوں کے مقابلے میں کم تھے۔ اس لیے بی اے میں وہ سائنس نہ لے سکے سائنس میں نمبروں کی کمی کے باوجود، چونکہ انگریزی، فارسی اور ریاضی وغیرہ میں ان کے نمبر بہت اچھے تھے اس لیے دو سال کے لیے انھیں پچیس روپے ماہوار کا وظیفہ ملا۔

بی اے کی تعلیم کے دوران، پہلے کی طرح وہ محنت نہ کر سکے۔ اور ان کی توجہ تعلیم کے علاوہ ملک کے دوسرے معاملات اور سرگرمیوں کی طرف زیادہ رہی۔ راجن بابو نے ۱۹۰۴ء میں ایف اے کا امتحان پاس کیا تھا اور اگلے سال جب وہ بی اے میں پڑھ رہے تھے، ۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم کی تحریک شروع ہوئی جس نے بہت سے نوجوانوں کی طرح راجن بابو کی توجہ بھی اپنی طرف کھینچ لی۔ اور اب وہ بجائے اس کے کہ اپنا پورا دھیان پڑھائی کی طرف دیتے۔ سیاسی جلسوں میں زیادہ وقت دینے لگے۔ لیکن پھر بھی بی اے کا جب نتیجہ نکلا تو وہ اول آنے والے طالب علموں میں شامل تھے۔ اس کی وجہ سے ان کو دو وظیفے ملے۔ ایک پچاس روپے کا جو ہر مہینے ملتا تھا۔ دوسرا چالیس روپے ماہانہ کا جو ایم اے پاس کر لینے کے بعد، اکٹھا ملا۔

راجن بابو بی اے کرنے کے بعد، کلکتہ ہی میں ایم اے اور بی ایل میں داخلہ

لیا۔ لیکن اسی زمانے میں نہ جانے کیسے اور کیونکر ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ یورپ جاکر آئی سی ایس کا امتحان دینا چاہیے۔ اس زمانے میں بڑے گھرانے کے لوگ حکومت میں بڑی بڑی نوکریاں حاصل کرنے کے لیے انگلستان جاکر آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان دیا کرتے تھے۔ ہمارے قومی رہنماؤں میں بھی کچھ لوگ ایسے تھے جنھوں نے یہ امتحان پاس کیا تھا یا اس میں شرکت کی تھی۔ مثلاً مولانا محمد علی نے جو کانگریس کے صدر بھی رہ چکے ہیں اور گاندھی جی کے ساتھ مل کر ملک کی آزادی میں، خاص طور پر خلافت اور ترک موالات (نان کوآپریشن) کی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ انگلستان جاکر اس امتحان کی تیاری کی تھی مگر اتفاق سے امتحان کامیاب نہ ہو سکے۔ دوسری مثال سبھاش چندر بوس کی ہے۔ جن کا آزادی کی لڑائی میں بہت بڑا حصہ ہے اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں ملک سے باہر آزاد ہند فوج بنائی تھی۔ اور چاہتے تھے کہ اس فوج کی مدد سے ملک کی آزادی حاصل کریں۔ مگر افسوس کہ ایک ہوائی جہاز کے حادثے میں ان کی وفات ہو گئی۔ انھوں نے آئی سی۔ ایس کے امتحان میں کامیابی بھی حاصل کر لی تھی اور حکومت میں ایک بڑا عہدہ مل گیا تھا۔ لیکن صرف دیش کی آزادی کی خاطر اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ راجن بابو اگرچہ حکومت کی نوکری کرنا نہیں چاہتے تھے، لیکن نہ جانے کیوں، ان کی بڑی خواہش تھی کہ اس امتحان کے لیے انگلستان جانا چاہیے۔ وہ خود لکھتے ہیں: "مجھ میں ایک دھن سوار ہو گئی کہ...... اب کسی طرح ولایت جاکر آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کرنا چاہیے۔ سرکاری نوکری کرنے کی خواہش نہیں تھی، لیکن تب بھی نہ معلوم دل میں کیسے اطمینان ہو گیا کہ یہ کرنے کے قابل ہے۔ اس میں بھائی نے بھی حوصلہ بڑھایا۔" مگر اس زمانے میں ہندوستان کے پرانے خاندانوں کے لوگ ولایت جانے کے خلاف تھے۔ پرانے بزرگ نہ جانے کیا کیا سوچتے اور اپنے نوجوانوں کو وہاں جانے کی اجازت نہ دیتے۔ جن لوگوں نے باپو کی کہانی پڑھی ہے، وہ جانتے ہیں کہ انھیں کن کن شرطوں کے بعد ولایت جانے کی اجازت ملی تھی۔ راجن بابو کے اس ارادے سے پہلے، ان کے علاقے اور ان کی ہی ذات (کائستھ) کے کچھ لوگ ولایت گئے تھے تو ان کے خلاف بڑا ہنگامہ ہوا تھا اور کچھ لوگوں کو

ذات برادری سے باہر بھی نکال دیا گیا تھا۔ اسی ڈر سے کہ گھر کے لوگ اجازت نہیں دیں گے وہ چپکے چپکے جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ مگر کسی نہ کسی طرح ان کے گھر والوں کو خبر لگ گئی۔ اب کیا تھا گھر میں کہرام مچ گیا۔ راجن بابو کو کلکتہ سے تار دے کر بلوایا گیا۔ اس وقت اتفاق سے ان کے والد کی طبیعت بھی خراب تھی۔ اس لیے بلانے کے لیے ایک بہانہ بھی مل گیا۔ جب وہ آ گئے تو ان کے والد نے ولایت جانے کے بارے میں سوال کیا۔ راجن بابو نے بھی سچ سچ بتلا دیا۔ اس کے بعد ان کے پتا جی نے سختی کے ساتھ منع کر دیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ اگر وہ گئے تو اس غم میں ان کی جان چلی جائے گی۔ ادھر ان کی ماتا جی بھی بڑی دکھی تھیں۔ یہ سب دیکھ کر راجن بابو نے سچے دل سے وعدہ کیا کہ اب وہ نہیں جائیں گے۔ ان کے پتا جی اور ماتا جی کو بھی ان کے وعدے کا یقین آ گیا۔ اور کلکتہ جانے کی اجازت دے دی۔ مگر ان کے والد کی طبیعت واقعی خراب تھی۔ ان کے وعدے پر وہ خوش ضرور ہو گئے اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ مگر زیادہ دنوں تک وہ زندہ نہیں رہے، ۱۹۰۷ء کے شروع میں، فروری یا مارچ کے مہینے میں ان کا دیہانت ہو گیا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے راجن بابو کی پڑھائی ویسی نہ ہو سکی جیسی ہونی چاہیے اس کی وجہ سے بی ایل کے امتحان میں تو وہ بیٹھے ہی نہیں اور ایم اے کے امتحان میں اول نہ آ سکے۔

ایم اے کرنے کے بعد باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا اور کام کرنے کا سوال پیدا ہوا۔ اسی زمانے میں ان کے ایک دوست نے اطلاع دی کہ مظفر پور کالج میں ایک جگہ خالی ہے۔ اس کے لیے وہ درخواست بھیج دیں۔ انھوں نے دوست کے مشورے پر عمل کیا اور ان کو وہ جگہ مل گئی۔ جولائی ۱۹۰۸ء میں کالج کھلا تو راجن بابو نے اس کالج میں کام شروع کر دیا۔ مگر کالج کی مالی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اس لیے وہاں کچھ زیادہ عرصے تک کام نہ کر سکے اور نو دس مہینے کے بعد وہاں سے الگ ہو گئے۔ اس کے بعد ان کے بڑے بھائی نے انھیں مشورہ دیا کہ قانون (لا) کا امتحان دے ڈالیں۔ تعلیم تو انھوں نے مکمل کر ہی لی تھی، صرف امتحان ہی دینا تھا۔ اور اس کے لیے تھوڑی بہت تیاری کرنی تھی۔

اس کے لیے مارچ ۱۹۰۹ء میں کلکتہ چلے گئے۔

اس زمانے میں بی ایل۔ کے دو امتحان ہوا کرتے تھے۔ ایک امتحان تو انھوں نے فوراً ہی دے دیا اور دوسرے کی تیاری میں لگ گئے۔ ہائی کورٹ میں وکالت کرنے کے لیے کسی وکیل کی رہنمائی میں دو سال کام کرنا پڑتا تھا۔ اس زمانے میں خان بہادر شمس الہدیٰ صاحب کی وکالت خوب چل رہی تھی۔ ایک دوست کے ساتھ ان سے ملے اور ان کی رہنمائی میں کام کرنے اور ان سے ٹریننگ لینے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اتفاق سے شمس الہدیٰ صاحب کے ساتھ دو آدمی پہلے سے ٹریننگ لے رہے تھے اور قاعدے مطابق ایک ساتھ دو آدمیوں سے زیادہ کو ٹریننگ نہیں دی جا سکتی تھی۔ اس لیے انھوں نے ایک دوسرے وکیل زاہد الرحیم زاہد سہروردی کے یہاں راجن بابو کی ٹریننگ کا انتظام کر دیا۔ اور کہا کہ جونہی ان کے یہاں جگہ خالی ہوگی، انھیں بلا لیں گے۔ یہ دوسرے وکیل کافی مشہور اور ہوشیار تھے۔ ان کے ساتھ راجن بابو نے کام شروع کر دیا۔ کچھ مدت کے بعد شمس الہدیٰ صاحب کے یہاں جگہ خالی ہوئی تو راجن بابو کو اپنے یہاں بلا لیا۔ راجن بابو میں محنت کرنے کی تو شروع سے ہی عادت تھی۔ نظر بھی اچھی تھی اس لیے بہت جلد شمس الہدیٰ کا بھروسہ حاصل کر لیا۔ راجن بابو مختلف مقدموں کے لیے جو نوٹ تیار کرتے تھے، ان سے وکیل صاحب نہ صرف یہ کہ پوری طرح مطمئن تھے۔ بلکہ خوش بھی تھے۔ اسی درمیان میں راجن بابو نے وکالت کا امتحان پاس کر لیا۔ اس لیے جب دو سال کی ٹریننگ پوری ہو گئی تو انھوں نے ۱۹۱۱ء میں اپنی وکالت شروع کر دی۔ شمس الہدیٰ صاحب نے وکالت شروع کرنے کے لیے نہ صرف یہ کہ اپنا ایک مقدمہ ان کو دے دیا، بلکہ پہلے دن خود بھی راجن بابو کے ساتھ عدالت میں آکر بیٹھے اور ان کی بحث کو غور سے سنتے رہے۔ شمس الہدیٰ صاحب کلکتہ کے بہت ہی سینئر وکیلوں میں سے تھے اور حکومت کے حلقے میں اچھی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اس زمانے میں یہ مشہور تھا کہ بنگال کے گورنر کی اگزیکٹو کونسل میں وہ لیے جانے والے ہیں۔ یہ خبر صحیح نکلی اور وہ لے لیے گئے۔ ایسے مشہور اور باا‌ثر وکیل کے یہاں ٹریننگ لینے اور ان سے اچھے تعلقات کی

وجہ سے راجن بابو کو اپنی وکالت کو کامیاب اور مستحکم بنانے میں بڑی مدد ملی بہت جلد ان کی وکالت چل نکلی اور مشہور وکیلوں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ ۱۹۱۵ء میں راجن بابو نے ایم ایل کا بھی امتحان دے دیا اور فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے۔

سیاست سے دلچسپی

اس سے پہلے ہم لکھ آئے ہیں کہ انٹرنس کے امتحان میں کامیابی کے بعد، ایف اے میں داخلہ لینے کے لیے جب راجن بابو کلکتہ گئے تو انھیں نئے حالات اور نئی زندگی سے واسطہ پڑا۔ وہاں کی بڑی بڑی اور شاندار عمارتیں دیکھ کر ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، وہ خود " اپنی کہانی میں لکھتے ہیں: " پہلا ہی موقع تھا کہ میں کلکتہ گیا۔ وہاں مکانوں، سڑکوں اور ٹرام گاڑی وغیرہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اور جب ہوسٹل پہنچا تو وہ مجھے چھپرا کے ڈیرے کے مقابلے میں محل جیسا لگا۔" اور جب وہ کلاس میں گئے تو طالب علموں کے لباس اور شکل وصورت دیکھ کر اور زیادہ اچنبھا ہوا۔ وہ لکھتے ہیں: "جب میں کلاس میں گیا تو وہاں کچھ دوسرا ہی عالم تھا۔ میں نے اتنے سر کھلے بنگالی لڑکے ایک ساتھ کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ان میں کچھ کوٹ پتلون، ہیٹ پہننے والے بھی تھے۔ ... میں نے کسی ہندوستانی لڑکے کو اس دن تک ہیٹ، کوٹ پہنے نہیں دیکھا تھا۔ اس سے میرے دل میں ایک شک ہوا کہ یہ لوگ اینگلو انڈین یا عیسائی ہوں گے۔ مگر جب نام پکارے گئے تو معلوم ہوا کہ وہ سب ہندو ہی ہیں" کلکتہ میں سیاست کا بھی بہت زور تھا۔ اور وہاں طالب علموں اور کالجوں میں آزادی کی تحریک کا اثر بہت زیادہ تھا۔ ان سب باتوں کا راجن بابو پر بھی اثر پڑا اور آہستہ آہستہ وہ سیاست میں دلچسپی لینے لگے۔ ہم پچھلے صفحات میں لکھ چکے ہیں کہ ۱۹۰۵ء میں جب بنگال کی تقسیم کا اندولن چلا تو اس سے راجن بابو بھی متاثر ہوئے تھے۔ ۷ راگست ۱۹۰۵ء کو ایک بہت بڑا جلسہ ہوا تھا جس میں بدیشی چیزوں کے بائیکاٹ اور سودیشی کے استعمال پر زور دیا گیا تھا۔ راجن بابو کے لیے سودیشی کا استعمال کوئی نئی بات نہیں تھی

اس لیے کہ وہ پہلے سے ہی صرف سودیشی کپڑا پہنا کرتے تھے۔ ان کی زندگی اتنی سادہ تھی کہ اس میں کسی بدیشی چیز کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ مگر سبھی طالب علم اور نوجوان ایسے نہیں تھے۔ بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی جو بدیشی چیزوں کا استعمال کرتے تھے اور ان میں کوئی برائی بھی نہیں سمجھتے تھے۔ راجن بابو لکھتے ہیں: "ہوسٹل کے لڑکوں میں بڑی ہلچل تھی۔ جو لوگ کبھی سودیشی کا استعمال نہ کرتے تھے انھوں نے بھی شروع کر دیا۔ ... طلبا میں نیا جوش اور نئی امنگ پیدا ہو گئی۔" ظاہر ہے راجن بابو ان حالات سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے تھے۔ مگر وہ کوئی فیصلہ جلدی میں نہیں کرنا چاہتے تھے۔

جب راجن بابو ایم اے اور بی ایل میں پڑھ رہے تھے تو بہار کے طلبا نے، جو کلکتہ میں پڑھتے تھے۔ یہ طے کیا کہ بنگال کے طالب علموں کی طرح انھیں بھی سودیشی کا پرچار کرنا چاہیے۔ لیکن چونکہ ان کی کوئی الگ سے تنظیم نہیں تھی اس لیے ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ بہاری طالب علموں کی ایک کانفرنس بلائی جائے اور اس میں اس معاملے پر غور کر کے کوئی فیصلہ کیا جائے۔ اس کانفرنس کے سلسلے میں اور لوگوں سے مشورہ کرنے کے لیے راجن بابو کو پٹنہ بھیجا گیا وہ پٹنہ گئے اور پہلے وہاں کے طالب علموں سے ملے۔ اس کے بعد بڑے اور مشہور لوگوں سے۔ سب نے اس کو خیال کو پسند کیا اور سب نے ایک رائے ہو کر مشورہ دیا کہ یہ کانفرنس پہلے پٹنہ میں بلائی جائے۔ چنانچہ پٹنہ کے مشہور اور نامی بیرسٹر شرف الدین صاحب کی صدارت میں اس کانفرنس کا پہلا جلسہ ہوا۔ جس میں بہار کے قریب سبھی کالجوں نے شرکت کی۔ راجن بابو نے اس میں پہلے سے لکھی ہوئی ایک لمبی تقریر کی۔ جس میں کانفرنس کے مقصد کی وضاحت کی گئی تھی۔ اس کانفرنس میں طے کیا گیا کہ جن شہروں میں اسکول اور کالج ہیں وہاں طالب علموں کی کمیٹیاں بنائی جائیں، ان کے علاوہ بہار کے تمام طالب علموں کی ایک مرکزی اور نمائندہ کمیٹی بنائی جائے۔ اس وقت تک ملک کے کسی حصے میں طالب علموں کی اس قسم کی کمیٹی بنائی نہیں گئی تھی، بہار میں پہلی مرتبہ بنائی گئی، جس کے قیام اور جس کی کامیابی میں راجن بابو کی کوششوں اور ان

کی سوجھ بوجھ کو بڑا دخل تھا۔ یہ کانفرنس ۱۹۰۶ء میں پہلی مرتبہ بلائی گئی تھی۔ اس کے بعد صوبے کے مختلف شہروں اور علاقوں میں اس کے سالانہ جلسے ہوتے رہے، جن کی صدارت بہار اور ملک کے مشہور رہنماؤں نے کی۔ مثلاً بہار کے: شرف الدین صاحب، حسن امام صاحب، ڈاکٹر سچدا نند سنہا صاحب، بابو پرمیشر لال صاحب، بابو دیپ نرائن سنگھ صاحب، بابو برج کشور پرشاد صاحب وغیرہ۔ بہار کے باہر کے لوگوں میں: ڈاکٹر اینی بیسنیٹ، مسز سروجنی نائیڈو، مہاتما گاندھی، مسٹر انڈریوز وغیرہ۔ یہ سلسلہ ۱۹۲۰ء تک کامیابی کے ساتھ چلتا رہا۔ اس کے بعد جب ترک موالات (نان کوآپریشن) کا اندولن چلا اور خلافت کی تحریک نے زور پکڑا تو سب کی توجہ اُدھر ہو گئی اور کانفرنس کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں اور بعد میں بالکل ہی ختم ہو گئیں۔

۱۹۰۲ء کے دسمبر میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا سالانہ اجلاس کلکتہ میں ہوا تو راجن بابو نے پہلی مرتبہ ایک والنٹیر کی حیثیت سے شرکت کی۔ اتفاق سے ان کی ڈیوٹی زیادہ تر پنڈال کے اندر تھی۔ اس لیے انھیں بڑے بڑے نیتاؤں اور لیڈروں کی تقریریں سننے کا موقع ملا۔ ان کی باتیں ان کے دل میں بیٹھ گئیں اور کانگرس اور آزادی کی تحریک سے ان میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا۔ ۱۹۱۱ء میں کلکتہ میں کانگرس کا دوبارہ اجلاس ہوا تو اس میں راجن بابو ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ کانگرس کے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے رہے، یہاں تک کہ خود کانگرس اور ملک کے بہت بڑے نیتا ہو گئے۔ اور ۱۹۳۴ء میں وہ خود کانگرس کے صدر منتخب ہوئے، جس کا اجلاس بمبئی میں ہوا۔

باپو کے قدموں میں

مہاتما گاندھی ۱۹۱۵ء میں دکھنی افریقہ سے، سیاسی اور سماجی خدمت انجام دینے کے بعد ہندوستان واپس آئے تو انھوں نے دیش کی حالت اور سیاست کو سمجھنے کے لیے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک دورہ شروع کیا اس زمانے میں بہار کے ایک ضلع چمپارن میں نیل کے کاشتکاروں پر بڑا سخت

ظلم ہو رہا تھا۔ بہار کے سماجی اور سیاسی کام کرنے والے اپنے طور پر اس ظلم کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر ان کو کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ جب انھوں نے سنا کہ گاندھی جی دیش کا دورہ کر رہے ہیں تو وہ لوگ ان سے ملے اور نیل کے کاشتکاروں کی بپتا بیان کی۔ گاندھی جی نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ جلد وقت نکال کر آئیں گے اور ان کی حالت اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے اور ان کی کہانی خود انہیں سے سنیں گے۔ چنانچہ اپریل ۱۹۱۷ء میں جب آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا جلسہ کلکتہ میں ہوا تو اس میں شرکت کے لیے گاندھی جی کلکتہ آئے۔ انھوں نے کلکتہ آنے سے قبل ہی یہاں کے ان لوگوں کو ایک چٹھی لکھ دی تھی جنھوں نے چمپارن کے ظلم کی تفصیل بیان کی تھی کہ وہ کلکتہ آجائیں تو گاندھی جی ان کے ساتھ بہار چلیں گے۔ کانگرس کے اس جلسے میں راجن بابو بھی شریک ہوئے، اور اتفاق سے ان کو گاندھی جی کے پاس ہی جگہ ملی۔ مگر گاندھی جی سے پہلے سے کوئی تعارف نہیں تھا اس لیے ان میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ راجن بابو کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ گاندھی جی کلکتہ سے بہار جانے والے ہیں۔ اس لیے جلسے کے بعد وہ جگن ناتھ پوری چلے گئے۔ اور گاندھی جی ان صاحب کے ساتھ پٹنہ گئے جو ان کو لینے کے لیے آئے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ بہار کے وہ صاحب جو گاندھی جی کے ساتھ تھے ان کو راجن بابو کے گھر لائے اور وہاں ٹھہرا دیا۔ راجن بابو تو تھے نہیں۔ ان کے نوکر نے سمجھا کہ یہ دونوں صاحب کسی مقدمے کے سلسلے میں آئے ہیں، اس لیے اس کمرے میں گاندھی جی کو ٹھہرا دیا جو مقدموں کے سلسلے میں وہاں آیا کرتے تھے اس نے ان کی ضرورتوں کے بارے میں کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ اس کی وجہ سے گاندھی جی کو اچھی خاصی تکلیف ہوئی۔ وہ تو خیریت یہ ہوئی کہ مظہر الحق صاحب کو خبر مل گئی اور وہ آکر گاندھی جی کو اپنے یہاں لے گئے۔ مظہر الحق صاحب پٹنہ کے مشہور سماجی اور سیاسی کارکن تھے اور گاندھی جی ان کو پہلے سے جانتے تھے۔ جب لوگوں نے چمپارن کے نیل کے کاشتکاروں کی حالت بیان کی تو گاندھی کو اس پر یقین نہیں آیا۔ اس لیے انھوں نے کہا کہ میں خود جاکر وہاں کی حالت دیکھوں گا۔ اور

اس کے بعد سوچ کر بتلاؤں گا کہ ان کے لیے کیا کیا جائے۔

چمپارن کا معاملہ یہ تھا کہ تقریباً سو سال سے وہاں انگریز نیل کی کھیتی کا کاروبار کرتے تھے۔ پورے ضلع میں جہاں جہاں نیل کی کھیتی کی جا سکتی تھی، وہاں انھوں نے کارخانے کھول لیے تھے اور زیادہ سے زیادہ زمین پر قبضہ کر لیا تھا۔ سرکار پر ان انگریزوں کا اتنا اثر تھا کہ وہ جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ اور جیسا قانون چاہتے بنوا لیتے، پولیس بھی وہی کرتی جو وہ چاہتے تھے۔

گاندھی جی جب پٹنہ سے چمپارن کے لیے روانہ ہوئے تو پہلے موتی ہاری گئے جو ضلع چمپارن کا بڑا اور اہم شہر ہے۔ گاندھی جی کے آنے کی جب کسانوں کو خبر ملی تو وہ سینکڑوں کی تعداد میں جمع ہو گئے اور اپنا دکھڑا بیان کرنے لگے۔ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس لیے لوکل گورنمنٹ میں کھلبلی مچ گئی۔ چنانچہ مظفر پور کے کمشنر کے آرڈر پر چمپارن کے ضلع مجسٹریٹ نے گاندھی جی کو چمپارن کے ضلع سے چلے جانے کا حکم دے دیا مگر گاندھی جی نے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس انکار پر حکومت نے ان کے خلاف مقدمہ کر دیا۔ اس کے بعد گاندھی جی نے تار کے ذریعہ خاص خاص لوگوں کو اس کی اطلاع کی اور خود مقدمے کی پیروی کی تیاری میں لگ گئے۔ جن لوگوں کو تار دیے گئے ان میں راجن بابو نے تار پا کر گاندھی جی سے تار ہی کے ذریعہ پوچھا کہ ان کو کیا کرنا ہے؟ گاندھی جی نے جواب دیا کہ دوستوں کے ساتھ چلے آؤ۔ چنانچہ راجن بابو مظہر الحق صاحب اور دوسرے لوگوں کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ یہ لوگ جب وہاں پہنچے تو مقدمے کی پہلی پیشی ہو چکی تھی اور گاندھی جی کچہری سے اسی وقت آئے تھے۔ گاندھی جی مظہر الحق صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ جب ان سے راجن بابو کا تعارف کرایا تو گاندھی جی نے کہا کہ میں آپ کے گھر گیا تھا۔ گاندھی جی کے ساتھ ان کے گھر آنے جانے میں جو سلوک ہوا تھا، اس کی تفصیل راجن بابو کو معلوم ہو چکی تھی۔ گاندھی جی کے اس ذکر پر ان کو شرمندگی ہوئی۔ اس لیے گاندھی جی نے اور باتیں شروع کر دیں۔

اگرچہ راجن بابو کی گاندھی جی سے یہ دوسری ملاقات تھی، مگر چونکہ کلکتہ کی پہلی ملاقات کے وقت تعارف نہ ہونے کی وجہ سے کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی

اس لیے اس ملاقات کو پہلی ملاقات کہہ سکتے ہیں۔ اس ملاقات کے بعد جب تک گاندھی جی چمپارن کے علاقے میں رہے، راجن بابو بھی ان کے ساتھ رہے۔ گاندھی جی کے کام کے طریقے دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر راجن بابو پر بہت اثر ہوا۔ ان کی ہر بات ان کے لیے نرالی اور ان کے کام کا طریقہ ان کے لیے بالکل نیا تھا۔ مثلاً گاندھی جی سچائی اور ایمانداری پر بہت زور دیتے تھے۔ چاہے اس میں اپنا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ وہ کہتے تھے کہ ڈر اور خوف دل سے نکال دو۔ کوئی کام نہ تو ڈر کی وجہ سے کرو اور نہ خوف کی وجہ سے کوئی کام چھوڑو۔ اس کی وجہ سے اگر کوئی مصیبت آتی ہے تو صبر کے ساتھ برداشت کرو۔ اس کے علاوہ ان کی زندگی بڑی سادہ تھی۔ وہ اپنا ذاتی کام زیادہ تر خود کرتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ ان کے ساتھ کام کرنے والے بھی ایسا ہی کریں۔ راجن بابو اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو ایسا کھرا اور سچا آدمی اب تک نہیں ملا تھا اس لیے گاندھی جی کی عقیدت اور عزت ان کے دلوں میں بیٹھ گئی اور وہ ان کی پوجا کرنے لگے۔

راجن بابو نے ۱۹۵۰ء میں گاندھی جی کے بارے میں ہندی میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا اردو ترجمہ ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کتاب کا نام ہے: "باپو کے قدموں میں"۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو (ہند) سے شائع ہوئی ہے اس وقت انجمن کے سکریٹری اردو کے مشہور ادیب اور مصنف قاضی عبدالغفار صاحب تھے۔ انھوں نے اس کتاب کی بڑی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "ہندوستان کی آزادی کی تاریخ کا ایک بہت اہم جزو ہے۔ کس طرح مہاتما گاندھی نے اپنے ساتھیوں کی اخلاقی تعمیر شروع کی اور کس طرح سول نافرمانی کا بیج اپنے وطن کی سرزمین پر ڈالا۔ یہ ایک بصیرت افروز کہانی ہے جو بہت سیدھے سادے اور سادہ الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔" اس کتاب میں ایک جگہ راجن بابو نے گاندھی جی کے بارے میں لکھا ہے: "ہم مذہبی اور پرانی کتابوں میں اولیا، رشی، دیوتا، فرشتہ اور اوتاروں کے تعریفیں کرتے ہیں۔ ان سے اپنی زندگی کے لیے بہت کچھ پاتے اور سیکھتے ہیں۔ جو کوئی ان کی بتائی ہوئی پرہیزگاریوں اور اعمالوں کو جتنا زیادہ اپنے لیے اختیار کرتا ہے۔ اس کی زندگی اتنی ہی ترقی کرتی ہے اور روشن ہوتی جاتی

ہے۔ اس طرح کی طاقتیں دنیا میں بہت کم دیکھی جاتی ہیں۔ اس لیے ان کو اَن دیکھی ہوئی اور سُنی ہوئی باتوں پر ہی بھروسہ کر کے اپنی زندگی کو ڈھالنے کی تدبیر کرنی پڑتی ہے۔ لیکن اگر کسی ایسی طاقت سے ہمارا ربط ہو جائے تو اس سے بڑھ کر دوسری خوش نصیبی انسان کے لیے نہیں ہو سکتی ہے۔ مہاتما گاندھی ایسی ہی طاقت والوں میں سے تھے۔ جن کے درشن اور ملاقات کی خوش نصیبی ہندوستان کے کروڑوں آدمیوں کو حاصل ہوئی۔"

عارضی حکومت میں وزیر

ہندوستان جب آزادی کے دروازے پر پہنچ گیا اور انگریزوں نے محسوس کر لیا کہ اب ہندوستان کی آزادی کو روکنا ممکن نہیں ہے تو انھوں نے ملک کی باگ ڈور ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں دینے کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ ۲ر ستمبر ۱۹۴۶ء کو پنڈت جواہر لال نہرو کی سرکردگی میں عارضی طور پر قومی حکومت بنائی گئی۔ جس کے بارہ وزیر مقرر ہوئے۔ ان بارہ وزیروں میں ایک وزیر راجندر بابو بھی تھے۔ اس زمانے میں ملک میں غلّے کی بڑی کمی تھی۔ ہمارا دیش اگرچہ بنیادی طور پر زرعی ملک ہے۔ مگر پھر بھی غلّے کے بارے میں ہمارا دیش دوسرے ملکوں کا محتاج تھا۔ چونکہ راجن بابو کے خلوص اور محنت پر لوگوں کو بھروسہ تھا۔ اس لیے ان کو خوراک اور زراعت کے محکمے سپرد کیے گئے۔ راجن بابو نے "اپنی کہانی" میں ایک جگہ لکھا ہے: "جب میں نے اس کام کو سنبھالا۔ حالت بہت نازک تھی اور ڈر معلوم ہوتا تھا کہ کسی نہ کسی دن لوگ غلّے کے بغیر مرنے لگ جائیں گے۔" اس لیے انھوں نے حالت کو بہتر بنانے کے لیے جان توڑ کوشش کی محکمے کے دوسرے کارکنوں نے بھی ان کا پورا پورا ساتھ دیا اور انھوں نے بھی بڑی محنت اور لگن سے کام کیا۔ راجن بابو کو دفتری کاموں کا اس سے پہلے کوئی خاص تجربہ نہیں تھا۔ تھوڑا بہت تجربہ میونسپلٹی کے چیرمینی کے زمانے میں ہوا تھا۔ مگر نئے حالات اور اتنی بڑی ذمہ داری کو دیکھتے ہوئے۔ وہ نہ ہونے کے برابر تھا لیکن دن ورات کی محنت اور سوجھ بوجھ سے کام لے کر انھوں نے بڑی حد تک

حالات پر قابو حاصل کر لیا۔ وہ خود جنوری ۴۸ ۱۹ء میں لکھتے ہیں، سنا ہے کہ لوگ میرے کام سے مطمئن ہیں۔ ابھی تک ملک غلّے کی قلت (کمی) کی جس مصیبت میں پڑا رہا ہے، اس سے رہائی تو نہیں ملی، مگر حالت کچھ بہتر ضرور ہوئی ہے۔ ... میں نہیں جانتا کہ میں نے خاص کام کیا ہے جس کے لیے مجھے مبارکباد یا شہرت ملنی چاہیے۔ مگر لوگ مطمئن ہیں اور بہت سے مانتے ہیں کہ میں نے حالت کو سنبھالا ہے۔"

دستور ساز اسمبلی کی صدارت

جب انگریزوں سے دیش کی بات چیت چل رہی تھی تو اور باتوں کے ساتھ یہ بھی طے پایا تھا کہ ایک دستور ساز اسمبلی بنائی جائے گی جو آزاد ہندوستان کے لیے نیا دستور تیار کرے گی۔ جب ملک عارضی حکومت قائم کی گئی تو اب ضروری ہو گیا کہ دستور ساز اسمبلی کا چناؤ کیا جائے اور نئے آئین / دستور کا کام شروع کیا جائے۔ اس کے لیے اگر نئے سرے سے الیکشن کرایا جاتا تو اس میں بہت وقت لگتا اور کام شروع کرنے میں بڑی دیر ہوتی۔ اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ مختلف صوبوں میں ابھی حال میں جو انتخابات ہوئے ہیں، انہیں ممبروں میں سے، مختلف فرقوں کی تعداد کے مطابق، ممبر منتخب ہو کر دستور ساز اسمبلی میں آئیں گے۔ چنانچہ جولائی ۴۶ ۱۹ء میں دستور ساز اسمبلی کا چناؤ ہوا۔ جس میں ۲۱۲ سیٹیں کانگریس کو ملیں۔ ۷۳ سیٹیں مسلم لیگ کو اور ۱۱ سیٹیں آزاد امیدواروں کو۔

۹ دسمبر ۴۶ ۱۹ء کو دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس بلایا گیا۔ چونکہ ابھی تک صدر کا چناؤ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے فوری طور پر کام چلانے کے لیے اسمبلی کے سب سے سینیر، بزرگ ممبر ڈاکٹر سچدا نند سنہا کو عارضی صدر مقرر کیا گیا۔

جب مستقل صدر کے چناؤ کا مسئلہ ممبروں کے سامنے آیا تو سب نے ایک رائے ہو کر راجن بابو کا نام پیش کیا۔ مگر راجن بابو اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے پاس کام بہت زیادہ ہے اور وہ اہم بھی بہت

ہے۔ یعنی خوراک اور زراعت کے محکمہ کا کام، اگر اس کے ساتھ ساتھ دستور ساز اسمبلی کی صدارت کا کام بھی ان کو دے دیا گیا تو وہ ٹھیک سے ان سب کاموں کو انجام نہ دے سکیں گے۔ لیکن لوگوں کے اصرار کے سامنے انھیں اپنا سر جھکانا پڑا اور اس ذمہ داری کو قبول کرنا پڑا۔ چنانچہ وہ صدر چن لیے گئے۔

۱۳ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو اسمبلی کا جب دوبارہ اجلاس ہوا تو عارضی صدر ڈاکٹر سچدا نند سنہا کی فرمائش پر، مولانا ابوالکلام آزاد اور آچاریہ کرپلانی، منتخب صدر بابو راجندر پرشاد کو صدارت کی کرسی تک لائے۔ صدارت کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد، انھوں نے ممبروں کا شکریہ ادا کیا، اس کے بعد فرمایا: "میں یقین دلاتا ہوں کہ اپنا مشکل فرض پارٹی پالیٹکس سے الگ ہو کر پوری طرح غیر جانبداری کی اسپرٹ میں ادا کروں گا۔ امید کہ آپ تمام لوگوں کا تعاون مجھے حاصل رہے گا۔ یہ ہاؤس قطعی طور پر سب سے بڑی جماعت ہے۔ اس کے کام میں کسی قسم کی باہر کی مداخلت برداشت نہیں کی جا سکتی۔ یہ اسمبلی ہندوستان کا ایسا قانون بنائے گی جو نہ صرف آزادی پر مبنی ہوگا اور اس ملک میں بسنے والے سب فرقوں اور طبقوں کے جائز مفاد کی ضمانت ہوگا بلکہ اخلاق، انصاف، برابری اور جمہوریت کے اصولوں کے لحاظ سے تمام دنیا کے لیے ایک نمونہ ہوگا۔"

راجن بابو کی اس مختصر تقریر کے بعد، عارضی حکومت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک ریزولیوشن پیش کیا جس میں دستور کے مقصد پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس پر تھوڑی سی بات چیت ہوئی۔ لیکن چونکہ مسلم لیگ کے ممبروں نے اب تک دستور ساز اسمبلی میں شرکت نہیں کی تھی۔ اس لیے ممبروں کی رائے ہوئی کہ فی الحال یہ ریزولیوشن ملتوی کر دیا جائے اور اگلے جلسے میں اس پر رائے لی جائے۔

۲۰ر جنوری ۱۹۴۷ء کو جب پھر اسمبلی کا اجلاس ہوا، اور اب بھی مسلم لیگ نے اس میں شرکت نہیں کی تو ریزولیوشن منظور کر دیا گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے اس ریزولیوشن میں جو کچھ لکھا تھا، دستور میں تمہید کے طور پر وہ درج ہے۔ اس سے ہمارے دستور کی خصوصیت اور اسپرٹ پر روشنی پڑتی ہے

اس لیے اسے نیچے درج کیا جاتا ہے۔

"ہم ہندوستان کے لوگوں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہندوستان کو ایک پورے اختیار والی عوامی جمہوریہ بنائیں اور اس کا بندوبست کریں کہ اس کے ہر شہری کو؛
انصاف ملے، سماجی اور سیاسی؛
آزادی ملے، خیال، بیان، عقیدے، مذہب اور عبادت کی؛
مساوات ملے، حیثیت اور موقعوں کے اعتبار سے؛
اور ہم نے یہ بھی طے کیا ہے کہ شہریوں کے درمیان اس طرح کا بھائی چارہ پیدا کریں کہ فرد کا وقار اور قوم کی ایکتا محفوظ رہے۔"

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ہمارا ملک مکمل طور پر آزاد ہو گیا اور مرکز میں عارضی حکومت کی جگہ مستقل حکومت قائم ہو گئی تو اس کے بعد دستور ساز اسمبلی نے زیادہ تیزی اور پوری آزادی کے ساتھ اپنا کام، یعنی دستور بنانے کا کام انجام دیا اور بالآخر ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو دستور تیار ہو گیا۔ ۹ دسمبر ۱۹۴۶ء سے ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء تک دستور ساز اسمبلی کے بارہ اجلاس ہوئے۔ اور اہم کاموں کے لیے چھ کمیٹیاں بنائی گئیں، جن کی تفصیل یوں ہے: اسٹیٹس (ریاستی) کمیٹی، یونین پاور کمیٹی اور یونین، کانسٹی ٹیوشنز کمیٹی۔ ان کمیٹیوں کے چیرمین پنڈت جواہر لال نہرو تھے۔ اور فنڈامنٹل رائٹس کمیٹی (بنیادی حقوق کمیٹی)، پراونشل کانسٹی ٹیوشنز کمیٹی اور مناریٹیز کمیٹی (اقلیتی کمیٹی)۔ ان کمیٹیوں کے چیرمین ولبھ بھائی پٹیل تھے۔ ان کمیٹیوں کی رپورٹیں اسمبلی میں پیش کی گئیں اور آخری مسودہ فروری ۱۹۴۸ء میں تیار کیا گیا۔ نومبر ۱۹۴۸ء سے نومبر ۱۹۴۹ء تک اسمبلی کے اجلاس اس وقت تک مسلسل ہوتے رہے۔ جب تک دستور تیار نہیں ہو گیا۔ ہمارا یہ دستور دنیا کے تمام دستوروں کے مقابلے میں سب سے بڑا ہے۔ اس میں کل ۳۹۵ دفعات ہیں اور آٹھ شیڈول (جدولیں) ہیں۔

نیا دستور ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو مکمل تو ہو گیا، مگر اب سوال تھا کہ اسے نافذ (لاگو) کب کیا جائے؟ چونکہ ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو کانگرس نے آزادی کا

عہد کیا تھا اور ہر سال ۲۶ رجنوری کو یہ عہد دہرایا جاتا تھا۔ اس لیے طے پایا کہ اگلے سال ۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ء کو نیا دستور نافذ کیا جائے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی طے پایا کہ نئے دستور کے مطابق، بالغ رائے دہندگان کے مطابق جب تک نئی پارلیمنٹ کا الیکشن نہ ہو یہی دستور ساز اسمبلی، پارلیمنٹ کے فرائض انجام دے گی۔

۲۴ رجنوری ۱۹۵۰ء کو دستور ساز اسمبلی کا آخری اجلاس ہوا۔ اس اجلاس سے دو گھنٹے پہلے، ہاؤس کو اطلاع دی گئی کہ نئے دستور کے مطابق جب تک دیش کے راشٹرپتی کا باقاعدہ چناؤ نہیں ہو جاتا، ڈاکٹر راجندر پرشاد جی کو عارضی راشٹرپتی نامزد کیا گیا۔ اس اعلان کے بعد، پنڈت جواہر لال نہرو نے راجن بابو کو مبارکباد دیتے ہوئے فرمایا، "ڈاکٹر راجندر پرشاد ہندوستان کے 'سپاہی' ہیں، میں انھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ آج وہ ہمارے رہنما جمہوریہ ہند کے صدر ہو گئے ہیں۔" اس کے بعد دستور پر دستخطوں کی کارروائی شروع ہوئی، جس میں دو گھنٹے لگے۔

عارضی راشٹرپتی

۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ء کو ڈاکٹر راجندر پرشاد نے دس بجکر ۲۶ منٹ پر عارضی راشٹرپتی کی حیثیت سے حلف لیا۔ حلف لینے کے بعد انھوں نے ایک مختصر سی تقریر کی جس میں انھوں نے فرمایا: "ہماری جمہوریہ کا مقصد ہر شہری کے ساتھ انصاف کرنا، آزادی دینا اور اس کے ساتھ برابری کا سلوک کرنا اور اس ملک کے باشندوں میں بھائی چارہ پیدا کرنا ہے۔ جن کے مذاہب، زبانیں اور رسم و رواج مختلف ہیں۔"

۳۱ جنوری ۱۹۵۰ء کو پارلیمنٹ کا اجلاس ہوا تو اس میں عارضی راشٹرپتی بابو راجندر پرشاد نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا: "ہندوستان کو جمہوریہ بنانے کے بعد اس کے کروڑوں انسانوں کی خدمت کا مقدس فرض ہم پر عائد ہوا ہے آپ نے مجھے صدر بنا کر جو بوجھ میرے کندھوں پر ڈالا ہے، خدا کرے کہ میں

اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرسکوں۔ اس اہم موقع پر ہمارے ذہن میں گاندھی جی کی یاد آتی ہے اور ہمارا دل ان کی عقیدت سے بھر جاتا ہے۔ انھوں نے ہم کو آزادی دلائی اور اتحاد، دوستی اور ایک دوسرے کی بھلائی کا پیغام دیا تاکہ ہمارے درمیان کسی قسم کا کوئی اختلاف باقی نہ رہے اور ہم ایک دوسرے کی مدد اور تعاون سے ہندوستان کو اونچا اٹھا سکیں۔" اپنی تقریر کے آخر میں انھوں نے فرمایا: ہمارے سامنے بھاری اور مشکل کام ہے، یہ کام کرنے کے لیے ہمیں جرأت اور اتحاد کی ضرورت ہے اور بڑی محنت کرنا پڑے گی۔ اسی کے ساتھ ہمیں کبھی یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہماری قومی ترقی اسی وقت ممکن ہے جب ہمارا قول اور عمل بے کھوٹ ہو اور ہم حق کے راستے سے نہ بھٹکیں۔"

پہلے راشٹرپتی

دستور کے مطابق جب راشٹرپتی کے چناؤ کے تمام انتظامات مکمل ہو گئے تو ۷ اپریل ۱۹۵۲ء کو الیکشن ہوا۔ راجندر بابو کا نام کانگریس نے پیش کیا۔ اور کانگریس کے مخالفوں نے کے۔ ٹی شاہ کا نام پیش کیا جو راجن بابو کے دوستوں میں سے تھے۔ شری شاہ نے راجن بابو سے کہا کہ اگر آپ کانگرس کے امیدوار نہ ہوتے تو میں آپ کا مقابلہ نہ کرتا۔ الیکشن کا نتیجہ نکلا تو راجن بابو بہت بڑی اکثریت سے جیت گئے۔ ۳۴۸۶ ووٹوں میں سے ۲۸۹۶ ووٹ راجن بابو کو ملے اور مخالف امیدوار کو صرف ۵۹۰ ووٹ ملے۔ ۱۳ مئی ۱۹۵۲ء کو پہلے راشٹرپتی کی حیثیت سے راجن بابو نے حلف لیا۔

۱۳ مئی ۱۹۵۲ء کو عہدہ سنبھالنے کے بعد صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنی پہلی تقریر میں عوام سے اپیل کی کہ "وہ ہر قیمت پر ملک کی آزادی کی حفاظت کریں جس کو سالہاسال کی جدوجہد کے بعد حاصل کیا گیا ہے۔" انھوں نے کہا کہ: "ہماری دلی خواہش ہے کہ ہم عوام کے معیار زندگی کو بلند کریں لیکن عوام کی حالت کو سدھارنے کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ اپنی آزادی کی حفاظت کریں۔" انھوں نے کہا کہ میں نے صدر جمہوریہ کی حیثیت سے ابھی اپنے عہدے کا حلف لیا

ہے اور اس کے ذریعے میں نے اپنے ارادوں کا اظہار کیا ہے کہ میں اس عظیم ملک کی خدمت دل و جان سے انجام دوں گا۔ میں جمہوریۂ ہند کے نشان کی حیثیت

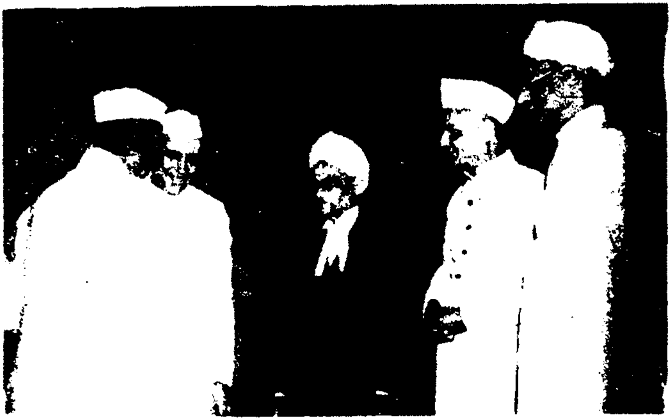

حلف لینے کے لیے جب راجن بابو پارلیمنٹ میں آئے تو وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے ان کا استقبال کیا

حلف لینے کے بعد راجن بابو کے ساتھ اُپ راشٹرپتی ڈاکٹر رادھاکرشنن، ایک طرف کنارے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد اور دیگر لوگ۔

سے آپ کے سامنے کھڑا ہوا ہوں۔ انھوں نے آخر میں کہا کہ: اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں میری پہلی کوشش یہ ہو گی کہ ملک کے مختلف حصوں میں

راشٹرپتی راجن بابو وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو حلف دلا رہے ہیں۔

وزیر تعلیم مولانا ابو الکلام آزاد راشٹرپتی سے حلف لے رہے ہیں

بسنے والوں، مختلف خیال اور مختلف عقیدے رکھنے والوں کے ساتھ یکساں اور غیر جانبدارانہ برتاؤ کروں۔ میرا دوسرا فرض یہ ہوگا کہ تمام دوسرے ملکوں کی دوستی حاصل کروں اور وہ ذریعے معلوم کروں جن سے ان کا تعاون (کوآپریشن) حاصل ہو سکتا ہے۔ اس ملک کے تمام باشندوں سے میری درخواست ہے کہ وہ مجھ سے اپنوں جیسا برتاؤ کریں اور مجھے اتنا موقع دیں کہ میں اپنی اہلیتوں کے مطابق ملک کی خدمت کر سکوں۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اتنی طاقت اور سمجھ اور عقلمندی دے کہ میں اپنے فرض کو اچھی طرح ادا کر سکوں۔"

بعد میں راشٹر پتی نے وزیروں سے حلف لیے۔

دوبارہ راشٹر پتی

راجن بابو کی جب پانچ سال کی مدت ختم ہونے کو آئی اور دوسرے چناؤ کا وقت آیا تو کانگریس پارٹی نے طے کیا کہ وہ دوبارہ راجن بابو ہی کا نام الیکشن کے لیے پیش کرے گی۔ راجن بابو لکھتے ہیں: "پنڈت جواہر لال میرے پاس آئے اور کہا کہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ دوبارہ آپ ہی کا نام راشٹر پتی کے عہدے کے لیے پیش کیا جائے۔" میں نے جواب دیا آپ لوگوں کی جو مرضی ہو، وہ مجھے منظور ہے۔ چنانچہ ۱۰ مئی ۱۹۵۷ء کو بھاری اکثریت سے راجن بابو دوبارہ راشٹر پتی کے عہدے کے لیے چن لیے گئے۔ ان کے مقابلے میں دو اور امیدوار تھے، ان کو اتنے کم ووٹ ملے کہ ان کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔

اسی سال، ۱۹۵۷ء میں جب راجن بابو دوبارہ راشٹر پتی چنے گئے، تو ہماری جنگ آزادی کو سو سال پورے ہو گئے تھے۔ اس لیے اس کی سویں سالگرہ منائی گئی۔ اس موقع پر ۱۴ اگست ۱۹۵۷ء کو رات کے وقت آل انڈیا ریڈیو سے راجن بابو نے ایک تقریر کی۔ یہ تقریر بہت بڑی ہے۔ اس لیے پوری تقریر تو یہاں نقل کرنا ممکن نہیں، اس کے دو مختصر ٹکڑے نیچے درج کیے جاتے ہیں۔ قوم کو پیغام دیتے ہوئے ہمارے راشٹر پتی جی نے فرمایا:

"آج سے تقریباً ایک سو سال پہلے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی

کی حکومت کے خلاف ملک بھر میں پھیلی ہوئی بے اطمینانی کے باعث ہندوستان میں بغاوت کا طوفان اُٹھا تھا۔ اسے چاہے کسی بھی نام سے پکارا جائے، ۱۸۵۷ء - ۱۸۵۷ء کی تحریک محض اتفاقی نہیں تھی۔ ہندوستان کے لوگوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو کبھی بھی اپنی خوشی سے منظور نہیں کیا تھا۔"

تقریر کے آخر میں راشٹرپتی بابو راجندر پرشاد جی نے فرمایا:

"آج جب ہم ۱۸۵۷ء کی تحریک کی سویں سالگرہ کی تقریب منا رہے ہیں تو میں اپنے تمام ہم وطنوں کو مبارکباد بھیجتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ہم اپنی سخت مشکل سے حاصل کی ہوئی آزادی سے ہمیشہ فیض پاتے رہیں، اس آزادی کو حاصل کرنے کے لیے ایک سو برس پہلے ہمارے ملک اور قوم نے وسیع پیمانے پر جدوجہد کی تھی۔"

مذہب کا گہرا اثر

راجن بابو کے حالات زندگی اور ان کی قومی خدمات کو مختصر طور پر بیان کیا جا چکا ہے۔ لیکن یہ کہانی نامکمل رہے گی اگر یہ نہ بتلایا جائے کہ ان کے دل و دماغ پر کن باتوں کا زیادہ اثر پڑا تھا اور ان کی شخصیت کیسی تھی۔ آخر میں ان ہی دو باتوں پر یہ کہانی ختم کی جا رہی ہے

بابو راجندر پرشاد جی کے حالات اور خیالات کا اچھی طرح جائزہ لیا جائے اور غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ وہ پکے مذہبی آدمی تھے۔ یہاں "پکے" کا مطلب "کٹر" کے نہیں ہیں، ان میں لوچ بھی تھا، وہ دوسرے مذہبوں کا احترام بھی کرتے تھے، تعصب اور تنگ نظری سے بہت دور تھے۔ لیکن اس کے ساتھ وہ اپنے مذہب کی اہم باتوں کو دل سے مانتے تھے اور ان پر عمل کرتے تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی مذہبی ماحول میں گزری تھی اور اس کا ان کے دل و دماغ پر بہت کافی اثر تھا اور یہ اثر آخر تک رہا۔ وہ "اپنی کہانی" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"رام نومی اور خاص کر جنم اشٹمی میں مٹھ میں تیاری ہوتی تھی،

ہم سب بچے کاغذ اور پنّی کے پھول کاٹ کر ٹھاکر باڑی کے دروازے اور سنگھاسن پر لگاتے تھے اور تقریب میں شریک ہوتے اور برت رکھتے تھے۔ اور دوہی کاندو کے دن خوب دہی ہلدی ایک دوسرے پر ڈالتے تھے۔ تقریباً ہر سال کارتک میں کوئی نہ کوئی پنڈت آجاتے جو ایک ڈیڑھ مہینہ رامائن بھاگوت یا کسی دوسرے پُران کی کتھا سناتے جس دن پورن آہوتی (آخری تقریب) ہوتی تھی۔ اس دن گاؤں کے سب لوگ جمع ہوتے تھے اور کچھ نہ کچھ پوجا چڑھاتے۔ میرے گھر سے زیادہ پوجا چڑھتی، کیوں کہ ہم سب سے بڑے سمجھے جاتے تھے اکثر کتھا بھی میرے ہی دروازے پر ہوا کرتی تھی، اس کا سارا خرچ ہم کو ہی دینا پڑتا تھا۔۔۔۔"

آگے چل کر راجن بابو نے لکھا ہے کہ: "ایک بات جس کا اثر مجھ پر بچپن ہی سے پڑا ہے رامائن کا پاٹھ ہے۔"

اسی طرح دیوالی اور دسہرہ بھی دھوم دھام سے منایا جاتا اور ان تہواروں میں راجن بابو بڑے شوق سے شریک ہوتے اور لطف لیتے۔ دسہرہ کے سلسلے میں ایک جگہ راجن بابو لکھتے ہیں:

"دسہرہ تو خاص کر زمینداروں کا تہوار مانا جاتا تھا۔ لیکن ہوراتر میں کبھی کبھی کالی جی کی پوجا ہوا کرتی تھی۔ اس کے لیے مورت لائی جاتی اور بڑے دھوم دھام سے پوجا ہوتی، اس کی شہرت سننے پر ہم سب بچے وہاں درشن کے لیے بھیجے گئے تھے۔ وہاں جاکر ہم نے کالی کا، جو سچ مچ کالی تھی اور ہاتھ میں لال کپڑا اور تلوار لیے ہوئے تھی، درشن کیا تھا۔ ۔۔۔ خاص دسہرہ کے دن ہمارے دادا صاحب اپنے ساتھ سب لوگوں کو لے کر ایک چھوٹا سا جلوس بنا کر نکلتے اور نیل کنٹھ کا درشن کرتے۔"

صرف ایک تہوار ایسا تھا جس میں راجن بابو نے غالباً کوئی حصّہ نہیں لیا، وہ ہے' ہولی۔ انھوں نے اپنی کتاب "آتم کتھا" (اپنی کہانی) میں اس

کا جس طرح ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ہولی میں ہونے والی باتیں بالکل پسند نہیں تھیں۔ اس کی خراب اور بُری رسموں کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"ہولی کے دن بہت گندی گالی گلوج ہوا کرتی، اس میں بڈھے، جوان اور لڑکے بھی ایک ساتھ شامل ہوتے، گاؤں کے ایک گوشے سے ایک جماعت چلتی جو تقریباً ہر دروازے پر کھڑے ہو کر گالیاں گاتی اور گندی مٹی، دُھول اور کیچڑ پھینکتے، جب کوئی نیا آدمی صاف ستھرا مل جاتا تو اس کی خوب گت بنتی ..... میں نے سنا ہے کہ اور جگہوں میں لوگ اس دن خوب شراب کباب کا بھی شغل کیا کرتے ہیں، مگر خوش قسمتی سے یہ اپنے گاؤں میں کبھی نہیں دیکھا راجپوت، برہمن اور بھومی ہار تو ہمارے ہاں شراب پینا گناہ سمجھتے ہیں، کہیں کائستھ لوگ پیتے ہیں مگر میرے گھر میں ایک بہت پرانا رواج چلا آرہا ہے۔ لوگوں کا عقیدہ ہے ہمارے خاندان میں جو شراب پیئے گا وہ کوڑھی ہو جائے گا۔ اس لیے وہاں کائستھوں کے گھروں میں کبھی شراب نہیں آتی۔ بڑوں کو دیکھ کر چھوٹے بھی اس سے پرہیز کرتے ہیں۔ یہ بات آج تک جاری ہے۔"

راجن بابو کے حالات میں ہم لکھ چکے ہیں کہ جب وہ مکتب میں پڑھتے تھے تو ایک مولوی صاحب انھیں پڑھاتے تھے۔ ان تہواروں کے موقع پر راجن بابو اور گھر کے لوگ ان مولوی صاحب کو بھی یاد رکھتے اور ان خوشیوں میں ان کو بھی شریک کرتے۔ اس سلسلے میں راجن بابو لکھتے ہیں:

"جس طرح ہندو محرم میں شریک ہوتے، اسی طرح مسلمان ہولی کے شور وغل میں شریک ہوتے۔ ہم بچے دسہرہ، دیوالی اور ہولی کے دن مولوی صاحب کی بنائی ہوئی عیدی اپنے بڑوں کو سناتے اور ان سے روپے مانگ کر مولوی صاحب کو دیتے۔ عیدی کئی دن پہلے سے ہم یاد کرتے۔ کاغذ پر مولوی صاحب کی مدد سے

خوبصورت پھول بنا کر لال، ہرے، پیلے اور بیگنی رنگ سے رنگتے۔ اس پر مولوی صاحب خوبصورت حرفوں میں عیدی لکھ دیتے، جسے ہم لوگ پڑھ کر سناتے۔ اس میں جو لکھا جاتا وہ بھی کچھ عجیب چوں چوں کا مربہ ہوتا۔ جیسے دیوالی کی عید میں لکھا ہوتا:

دیوالی آمدِ ہنگام مجوا وغیرہ

دسہرہ کی عیدی میں لکھا جاتا:

بنا کر روپ جوگی و قلندر وغیرہ

مشاہرہ کے علاوہ مولوی صاحب کو ہر ایک جمعرات کچھ پیسے جمعراتی کے روپ میں اور تہوار کو عیدی کے بدلے میں مل جایا کرتے تھے۔"

چھپرا اسکول میں جب راجن بابو پڑھتے تھے تو وہاں ایسے پنڈتوں کی صحبت ملی جو بہت کٹر قسم کے مذہبی تھے اور وہ لوگ چھوت چھات پر سختی سے عمل کرتے تھے، اس کا اثر راجندر بابو پر پڑنا لازمی تھا۔ چنانچہ وہ بھی سختی سے چھوت چھات کے قائل تھے۔ تفصیل راجن بابو سے سنیئے:

"چھپرا اسکول میں پڑھنے کے زمانے میں میں وہاں ایک پنڈت جی کے یہاں رہا کرتا تھا جو ایک بڑے نامی جوتشی تھے، ان کا نام تھا پنڈت وِکرمادت مشر، وہی میرے سرپرست کی جگہ تھے، وہ خود طلبا کو پڑھایا کرتے تھے، ہر روز سرجو میں اشنان کیا کرتے تھے۔ پوجا پاٹ خوب ہوا کرتا، وہیں پر ایک چھوٹا سا ٹھاکر دوارہ بھی ٹھقوا راج کا تھا ان سب کا اثر ہم چھوٹے لڑکوں پر ویسا ہی پڑا جیسا پڑنا چاہیے ہم لوگ اپنے آپ کو کٹر سناتنی سمجھتے اور اگر کوئی آریہ سماجی آجاتا تو اس سے بحث بھی چھیڑ دیتے۔ اسکول میں مہامہو پادھیائے رگھونندن ترپاٹھی ہیڈ پنڈت تھے۔ اسکول میں میں فارسی پڑھتا تھا مگر ان کے ذریعے سے گھر پر سنسکرت پڑھنا بھی شروع کی۔ رگھو ونش کے کچھ سوتر حفظ کر لیے مگر اس کو جاری نہ رکھ سکا۔ چھپرا اسکول کی یادیں آج بھی دل پر اثر رکھتی ہیں۔ وہ حسین اور لطیف ہیں۔"

لیکن ایک مدت کے بعد، چمپارن میں گاندھی جی کا کچھ دنوں ساتھ رہا اور ان کی شخصیت سے راجن بابو متاثر ہوئے تو چھوت چھات کو یکسر چھوڑ دیا۔ راجن بابو "اپنی کہانی" (آتم کتھا) میں لکھتے ہیں :

" چمپارن میں ہماری زندگی پر بھی بڑا اثر پڑا۔ وہیں ہم لوگوں نے ذات پات کا امتیاز چھوڑا۔ اس زمانے تک میں ذات پات کو بہت مانتا اور اس پر عمل کرتا تھا۔ برہمن کے سوا کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ کا چھُوا ہوا دال بھات (چاول) وغیرہ، جسے وہ کچّی رسوئی کہتے ہیں، کبھی نہیں کھایا تھا۔ گاندھی جی نے کہا کہ وہاں اگر چوکا کرتے رہو گے تو کیسے کام چلے گا۔ جو لوگ ایک ہی کام سے لگے، مان لو کہ سب ایک ذات کے ہیں۔ پس ہم لوگ ایک دوسرے کا پکا یا کھانا کھانے لگے اگرچہ ہم میں کئی ذاتوں کے لوگ تھے۔"

راجن بابو کی زندگی کا ایک اور واقعہ دلچسپ اور اہم ہے۔ جب وہ کلکتہ کے مشہور بیرسٹر شمس الہدیٰ صاحب کے ساتھ وکالت کی ٹریننگ لے رہے تھے اور ان کے مکان ہی میں رہتے تھے تو اسی زمانے میں بقرعید کا تہوار آیا۔ راجن بابو، یہ سوچ کر کہ ان کے یہاں گائے کی قربانی ہوگی، وہ چند دنوں کے لیے ان کے یہاں سے چلے گئے۔ تفصیل خود راجن بابو سے سنیے :

" میں ان کے (شمس الہدیٰ صاحب کے) مکان میں ٹھہرا تھا۔ بقرعید کا دن آگیا۔ محلّہ بھی مسلمانوں کا تھا، یعنی اکثریت مسلمانوں کی تھی، میں نے سوچا کہ شاید قربانی ہو، میں ایک سناتنی ہندو ہوں۔ میں نے سوچا کہ اچھا ہو کہ میں اس موقع پر دو چار دن کے لیے کہیں ٹل جاؤں۔ میں ان سے بغیر کچھ کہے ہی وہاں سے چلا گیا ..... تین چار دنوں کے بعد واپس آیا تو انھوں نے پوچھا کہ کہاں چلے گئے تھے؟ میں نے سب باتیں صاف نہیں کہیں، اتنا ہی کہا کہ دو تین دن کے لیے کچھ دوستوں کے پاس چلا گیا تھا۔ انھوں نے کہا، میں سمجھ گیا تم بقرعید کی وجہ سے چلے گئے تھے۔ تم نے سوچا ہوگا کہ یہاں گائے کی

قربانی ہوئی، اس لیے یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ کیا تم نے میرے ساتھ بے انصافی نہیں کی؟ تم نے سمجھ لیا کہ تمھارے جذبات کا میں کچھ بھی خیال نہیں کروں گا۔ تم تو تم ہو، میرے گھر میں کئی نوکر ہندو ہیں۔ پھلواری کا مالی ہندو ہے۔ گایوں کی داشت (رکھوالی) کے لیے بھی نوکر ہندو ہے۔ کیا ان کے جذبات کا خیال میں نہیں رکھتا ہوں؟ کیا ان کا دل نہیں دکھتا؟ تم کو مجھ سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔ میرے گھر میں اپنے گھر کے نوکروں کے خیال سے گائے کی قربانی نہیں ہوتی۔" مجھے بہت شرمندہ ہونا پڑا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ میں نے ان کے ساتھ بے انصافی کی تھی۔"

ان سب باتوں کا ہم نے ذرا تفصیل سے اس لیے ذکر کیا ہے کہ جب تک کوئی شخص ان سب باتوں کو تفصیل سے نہ جان لے، راجن بابو کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔ کوئی بھی ہو جب بہت سے لوگوں سے مل جل کر کوئی کام کرتا ہے، اس کام کے سلسلے میں مختلف مذہب کے ماننے والوں اور مختلف فرقوں سے واسطہ پڑتا ہے تو ان سب کے خیالات کا ایک دوسرے پر اثر پڑنا ضروری ہے۔ مختلف فرقوں کے لوگوں میں ایک دوسرے کے بارے میں کچھ نہ کچھ غلط فہمیاں بھی ہوتی ہیں، ایک ساتھ رہنے اور کام کرنے سے یہ غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔ راجن بابو اگرچہ شروع میں کٹر سناتنی ہندو تھے۔ مگر جوں جوں وہ دیش کے سماج کی سیوا اور ملک کی آزادی کی لڑائی میں آگے بڑھتے گئے اور مختلف ذات پات کے لوگوں اور مختلف علاقوں اور مختلف خیال رکھنے والوں کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کا موقع ملا تو جہاں انھوں نے اپنی شخصیت سے دوسروں کو متاثر کیا، وہاں وہ خود بھی دوسروں سے کافی متاثر ہوئے۔

شخصیت

اب جب راجن بابو ہم میں نہیں رہے تو ان کی خوبیاں اور اچھائیاں ہم کو یاد آتی ہیں۔ وہ ہمیشہ ہی بہت سادگی سے رہتے تھے۔ کھانا پینا ہو یا

کپڑے ہوں یا رہن سہن ہو، ہمیشہ سادگی کا خیال رکھتے۔ یہ خیال اس وقت تو تھا ہی جب وہ پڑھتے اور خرچ کے لیے بہت زیادہ پیسے نہیں تھے۔ مگر یہ سادگی اس وقت بھی قائم رہی جب وہ کمانے لگے اور ان کی وکالت خوب چلنے لگی۔ اور یہ سادگی اس وقت بھی جب وہ ملک سے بڑے عہدے پر پہنچ گئے اور رہنے کے لیے راشٹرپتی بھون جیسی خوبصورت اور عالی شان عمارت ملی۔ دس ہزار روپے ماہوار تنخواہ تھی۔ الاؤنس اور مہمانوں کی خاطر مدارات کے لیے اس کے علاوہ رقم مقرر تھی۔

مستقل طور پر راشٹرپتی ہونے کے بعد، انھوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی تنخواہ گھٹا کر آدھی کر دی۔ انھوں نے سوچا کہ اتنی بڑی تنخواہ ہندستان جیسے غریب ملک کے لیے بہت زیادہ ہے۔ اس لیے وہ جیسی سادہ زندگی گزارتے رہے ہیں اور اب بھی ویسی ہی زندگی گزارنا چاہتے ہیں اس لیے اتنی بڑی تنخواہ لے کر وہ کیا کریں گے۔ یہ سب سوچ کر ۱۱ رمئی ۱۹۵۲ء کو وزیر اعظم کو ایک چٹھی لکھی، لیکن راشٹرپتی کی تنخواہ اور الاؤنس وغیرہ ملک کے دستور میں لکھا ہوا ہے۔ اس لیے اب تنخواہ کی کمی پر غور کرنے اور دستور میں ردّ و بدل کرنے میں بڑا جھنجھٹ ہے، اس لیے انھوں نے خود ہی اپنی تنخواہ میں آدھی کمی کر دی۔ اس طرح ٹیکس کا ملنے کے بعد انھیں صرف دو ہزار آٹھ سو روپے ملتے تھے۔ اس عہدے پر کام کرنے کی وجہ سے، قاعدے کے مطابق وہ جس الاؤنس کے حقدار تھے۔ اس کو کبھی نہیں لیا۔ اسی طرح مہمانوں کو کھلانے پلانے اور خاطر مدارات کے لیے خرچ کرنے کو ان کو جو اختیار ملا ہوا تھا، اس سے بھی کبھی فائدہ نہیں اٹھایا اور ذاتی مہمانوں پر اپنی تنخواہ سے خرچ کرتے رہے۔

نہ جانے آج کل کے نوجوانوں کو معلوم ہے یا نہیں کہ ہندوستان کی تحریک آزادی میں چرخے کی کیا اہمیت ہے۔ اس وقت اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ لیکن اتنا ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ جب آزادی کا آندولن زوروں پر تھا تو ہر کانگریسی پابندی کے ساتھ چرخہ کاتتا تھا۔ راجن بابو راشٹرپتی

ہونے کے بعد چرخہ کاتا کرتے تھے۔

راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد، چرخہ کاتتے ہوئے۔

راجن بابو کو اپنے علاقے اور گاؤں کے لوگوں سے بڑا لگاؤ اور تعلق تھا۔ ہر دور اور ہر زمانے میں ان کے گاؤں کے لوگوں نے ان کا ساتھ دیا تھا اور وہ ان کی بڑی عزت اور قدر کرتے تھے۔ بہت سے لوگ بڑے ہونے اور بڑے عہدے پر پہنچ جانے کے بعد، چھوٹے اور معمولی لوگوں کو بھول جاتے ہیں، مگر راجن بابو ان لوگوں میں سے نہیں تھے۔ راشٹرپتی ہونے کے بعد بھی ان سے ملتے جلتے رہے اور پہلے ہی کی طرح، بے تکلفی کے ساتھ ان سے ملتے۔

راجن بابو کو شروع ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ اپنی پڑھائی

کے زمانے میں انھوں نے جتنی محنت کی اور امتحانوں میں انھوں نے جتنی شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ ان کی تفصیل اس کتاب کے شروع میں لکھی جاچکی ہے

راشٹرپتی بابو راجندر پرشاد اپنے گاؤں زیرادیئی کے لوگوں سے باتیں کرتے ہوئے

اسی طرح انھوں نے جو کتابیں لکھی ہیں، ان کا بھی بالکل شروع میں ذکر کیا جاچکا ہے۔ راشٹرپتی ہونے کے بعد بھی، جب ان پر کام کا بہت بوجھ پڑ گیا تھا اور دیش کی ضرورت کی وجہ سے ملک کے اندر اور باہر دورے بھی کرنے پڑتے تھے، مگر ان تمام مصروفیتوں کے باوجود پڑھنے کے لیے کسی نہ کسی طرح وقت ضرور نکال لیتے تھے۔

افسوس کہ راشٹرپتی ہونے کے بعد یا ریٹائر ہونے کے بعد انھوں

نے کوئی کتاب نہیں لکھی، ورنہ وہ بہت دلچسپ، بہت مفید اور پڑھنے کے لائق ہوتی۔ راجن بابو کی "آتم کتھا" کا اردو ترجمہ مئی ۱۹۶۱ء میں شائع ہو رہا تھا تو انھوں نے اس کے لیے ایک صفحہ کا جو پیش لفظ لکھا ہے، اس

راشٹرپتی بھون کی لائبریری میں راجن بابو مطالعہ کر رہے ہیں

میں چند بہت اہم باتیں لکھی ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

"اس مدت میں ہندوستان اور دنیا میں بہت سے واقعات ہوئے، ملک میں ایک اور انتخاب ہوا اور میں پھر راشٹرپتی چُن لیا گیا۔ ریاستی پُنر گٹھن کمیشن کی رپورٹ کے مطابق جو صوبہ بندیاں ہوئی تھیں ان میں بھی کئی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ ہمارے تیس سال

کے ساتھی مولانا ابوالکلام آزاد فروری ۱۹۵۸ء میں قلیل علالت کے بعد رحلت فرما گئے۔ جب میں ان کی لاش کے پاس آنسو بہا رہا تھا تو ۱۹۱۸ء سے اب تک کے واقعات کی تصویریں میرے ذہن میں گشت کر رہی تھیں۔ بہار کے ساتھیوں میں انوگرہ بابو بھی اب نہیں رہے۔"

سب سے زیادہ دل پر اثر کرنے والی یہ بات لکھی ہے:

"۱۹۶۰ء کی ۲۶ جنوری کا سویرا مجھے کبھی نہیں بھول سکتا۔ ایک طرف میری بڑی بہن بھگوتی دیوی کی لاش میرے گھر میں تھی اور دوسری طرف مجھے جشنِ جمہوریت کے جلوس میں شامل ہونا تھا۔ وہ (یعنی راجن بابو کی بہن) ابتدائی عمر میں ہی بیوہ ہو گئی تھیں اور جب سے ہمارے ہی یہاں رہتی تھیں۔ چودہ سال مجھ سے بڑی ہونے کی وجہ سے، وہ میرے لیے ماں کی طرح تھیں۔ ایک طرف قومی جشن کا شاندار تہوار اور دوسری طرف میرے لیے یہ صدمہ۔ میں نے نہیں چاہا کہ قومی جشن میں میرے ذاتی دکھ سے کچھ خلل پڑے۔ لاش کو گھر پر چھوڑ کر جلوس میں شامل ہوا اور فوجوں وغیرہ کی سلامی لے کر گھر واپس آیا، تو دوپہر کو داہ کرم کرنے کے لیے شمشان گیا۔ جلوس میں جب میری سواری نکل رہی تھی تو بار بار خیال آتا رہا کہ دنیا اس کو کہتے ہیں۔"

اس چھوٹی سی تحریر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر وہ کوئی کتاب لکھتے تو وہ کتنی اہم اور کتنی دلچسپ ہوتی۔

پچھلے صفحوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ اچھی طرح ہو گیا ہوگا کہ راجن بابو کتنے اچھے انسان تھے۔ مخلص رہنما، ملک و قوم کے سچے دوست اور اچھا چاہنے والے اور کھرے آدمی تھے۔ جو بھی ان سے ملتا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ بہت پہلے پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے رام گڑھ کے خطبے میں، راجن بابو کے بارے میں کہا تھا:

"ہم اکثر غلطیاں کرتے ہیں، ہماری قوم سیدھے راستے سے بھٹک جاتی ہے۔ ہماری زبانیں پھسل جاتی ہیں۔ لیکن ہم میں ایک ایسا انسان بھی ہے، جو کبھی غلطی نہیں کرتا، اس کے قدموں میں کبھی لغزش نہیں آتی، وہ جب کوئی بات کہہ دیتا ہے تو اس کو کبھی واپس نہیں لیتا اور جب کوئی کام شروع کر دیتا ہے تو اسے ادھورا نہیں چھوڑتا۔"

○○